خلافت و جمہوریت
عطا محمد جنجوعہ، سرگودھا

خلفاے راشدین کا تعین شورائی تھا!

خلافت میں خلیفہ کا تعین عوام کی بجائے اہل حل وعقد کرتے ہیں اور خلیفہ کے تعین کے لئے یہ اقدام 'بیعت خاصہ' کہلاتا ہے جو خلیفہ کی تعیناتی کے ساتھ اس کی اطاعت کی بیعت بھی ہوتی ہے جس کی توثیق وعہد بعد میں عامۃ المسلمین کی 'بیعتِ عامہ' کی صورت ہوتی ہے۔ لیکن خلیفہ کے درست تعین کا حقیقی دارومدار کسی بھی خارجی ودیگر منفعت کی بجائے نفاذِ شریعت کے لئے اَصلح ترین فرد کی صورت ہوتا ہے۔ یہ اصلح ترین فرد قریبی رشتہ دار بھی ہوسکتا ہے اور مسلمانوں میں سے کوئی موزوں ترین شخص بھی۔ مزید تفصیلات کے لئے علامہ ابن تیمیہؒ کی کتاب 'السیاسیہ الشرعیہ' اور مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ کی 'خلافت وجمہوریت' مطالعہ فرمائیں۔ ح م

فطری امر ہے کہ حاکم قوم کے نظریات محکوموں پراثر انداز ہوتے ہیں۔ انقلابِ فرانس کے بعد یورپی ریاستوں میں جمہوری نظام رائج ہوا تو آزادی، مساوات اور اُخوت کے دلفریب نعروں کے اثرات محکوم مسلم ریاستوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں سرایت کرگئے جنہوں نے مغربی نظامِ سیاست کو بنیاد بنا کر اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اُنہوں نے خلافتِ راشدہ کے دور کو جمہوری قرار دیا اور ان کے بعد مسلم حکمرانوں کو ملوکیت کا طعنہ دے کر اسلامی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

تاریخ اسلام کے پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم حسن، قاہرہ (پی ایچ ڈی لندن) نے تجزیہ کیا کہ ''آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد خلفاے راشدین کا دور آیا، اس عہد میں فرمانروا کا انتخاب شوریٰ کے ذریعے کیا جاتا تھا، لیکن بنی اُمیہ اور بنی عباس کے عہدِ خلافت میں یہ جمہوری طریقہ خودسری اور موروثی حکومت کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ اس زمانہ میں شوریٰ کا وجود ختم ہوگیا اور انتخاب صرف نام کو رہ گیا۔ فقہا نے اسی بادشاہی نظامِ حکومت کے جواز کو ثابت کرنے کے لیے اس قسم کی احادیث سے استدلال کی کوشش کی ہے کہ ''خلافت میرے بعد چالیس سال تک رہے گی، پھر جبر واستبداد کی حکومت ہوجائے گی۔''

سر ٹامس آرنلڈ کا خیال ہے کہ اس قسم کی بہت سی احادیث اس نظامِ استبدادی کی صحت کو ذہن نشین کرانے کے لیے آنحضرت ﷺ کی طرف غلط منسوب کردی گئی ہیں اور فقہاے اسلام نے اسی نظریہ کی تائید میں لکھا کہ ائمہ قریش سے ہوں گے۔''

(مسلمانوں کا نظم مملکت: ص۲۳ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)

مصر میں پروان چڑھنے والے نظریات برصغیر میں نمودار ہوئے، چند سکالر صاحبان نے یورپی تہذیب وتمدن پر تنقید کی، لیکن مغربی نظامِ سیاست کو اسلامی لبادہ پہنانے میں عرق ریزی کی جن سے عصری تعلیمی اداروں سے فارغ ہونے والا طبقہ بھی متاثر ہوا اور اُنہوں نے برملا اظہار کیا:

''غلط بات ہے کہ سقوطِ خلافت ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ سقوطِ خلافت تو اسی وقت ہوگیا جب دورِ خلافت کو منقطع کردیا گیا۔'' ('کتابِ خلافت' ص۱۶ از چوہدری رحمت علی)

جن خلفا کے دور میں مسلمانوں نے ہندوستان، سپین، خراسان اور افریقہ میں اسلام کا پرچم لہرایا۔ حیرت ہے کہ جدت پسند مسلم سکالر اُن کو اس لیے خلیفہ تسلیم نہیں کرتے کہ اُن کو عوام نے منتخب نہیں کیا۔ غور طلب پہلو یہ ہے کہ جمہوری نظام کے طور طریقے کیا مسلمانوں کی اختراع ہے؟

'جمہوریت' مسلمانوں کا متعارف کردہ نظام نہیں۔

عالم عرب کے معروف سکالر ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے آزادیٔ رائے اور محاسبہ کے واقعات کی آڑ میں جمہوری نظام کے حق میں دلائل دیئے ہیں۔ لیکن اس امر کا اعتراف انہوں نے بھی کیا ہے کہ جمہوریت مسلمانوں کی اختراع نہیں ہے:

''جمہوریت کو جمہوریت کا نام عطا کرنے والے اور اس کے اُصول وقواعد وضع کرنے والے اگرچہ ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہیں، لیکن اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہم غیر قوموں سے اچھی باتیں سیکھیں اور اُنہیں اختیار کریں حضور ﷺ کی تعلیم بھی یہی ہے کہ حکمت و دانائی کی باتیں مؤمن کی گم شدہ دولت ہے جہاں سے اُنہیں یہ دولت مل جائے اُنہیں اختیار کرنا چاہئے چنانچہ حکمت و دانائی کی باتیں اور نفع بخش چیزیں اگر ہمیں غیر مسلموں سے ملتی ہیں تو ہمیں اُنہیں اختیار کرنا چاہئے۔ یہی حضور ﷺ کی تعلیم ہے اور اسی پر حضورؐ اور خلفاے راشدین کا عمل تھا۔'' (فتاویٰ ڈاکٹر یوسف القرضاوی: جلد دوم رص ۲۴۹)

علامہ نے متعدد واقعات پیش کر کے اُمتِ مسلمہ کو دعوت دی ہے کہ غیر مسلموں سے حکمت کی باتیں حاصل ہو جائیں تو اُنہیں اختیار کر لینا چاہیے تاہم قرضاوی صاحب کی مذکورہ عبارت اس بات کا بھی بین ثبوت ہے کہ خلفاے راشدین کا دور جمہوری نہ تھا۔

اس جمہوری ملک میں ہر بالغ عاقل مسلمان قومی انتخاب میں حصہ لے سکتا ہے اور اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔ جمہوری نظام میں کثرتِ رائے معیارِ حق ہے۔ مذکورہ اُصول کو مدنظر رکھ کر خلفاے راشدین کے انتخاب کا مطالعہ کریں۔ نبی مکرم ﷺ فوت ہوئے تو سعد بن عبادہ نے انصاریوں کو سقیفہ بن ساعدہ میں امرِ خلافت طے کرنے کے لیے اکٹھا کیا۔ تب حضرت ابوبکرؓ و عمر فاروقؓ دیگر تین ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچے۔ انصار کے خطیب (ثابت بن قیسؓ) نے کہا کہ ہم اللہ کے دین کے معاون اور اسلام کی فوج ہیں اور اے مہاجرین! تم تھوڑی سی جماعت ہو جو اپنی قوم قریش سے نکل کر ہم میں آئی ہو اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی تقریر میں انصار کی خدمات کا اعتراف کیا اور سعدؓ بن عبادہ کو رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد سنایا:

> ''اے سعد! تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا...... اس وقت تم موجود تھے...... کہ قریش امرِ خلافت کے والی ہیں، اُن کے نیک نیکوں کا اور فاجر فاجروں کا اتباع کرتے ہیں۔''
>
> تو سعد نے جواب دیا کہ آپ نے سچ کہا کہ ہم وزیر ہوں گے اور تم امیر۔''

امامت قریش میں ہوگی!

خاتم النّبیین ﷺ کا فرمان سن کر انصار نے اپنی گردنیں جھکا دیں اور اپنے سردار سے آنکھیں پھیر کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔

انصار کو مذکورہ حدیث کی صحت پر اتنا اعتماد و یقین تھا کہ وہ تاریخ کے کسی موقع پر خلافت کے حصول کے لیے اُمیدوار بن کر سامنے نہیں آئے۔ لیکن لندن میں پی ایچ ڈی کرنے والے مصری سکالر ڈاکٹر حسن ابراہیم نے انگریز محقق سر ٹامس آرنلڈ کے کہنے پر اس کی صحت سے انکار کر دیا چونکہ جمہوری نظام میں ہر شہری صدارتی اُمیدوار بننے کا قانونی حق رکھتا ہے، لیکن اس حدیث نے خلافت کو قریش تک محدود کر کے اس جمہوری اُصول کی نفی کی ہے، اس لیے مغربی فلسفہ و فکر سے متاثر افراد نے انکار کر دیا۔

امام ابن خلدون نے الأئمة من قریش کہ امام قریش سے ہوں گے، کے ضعف پر اپنے مقدمہ میں بحث نہیں کی۔ بلکہ اس شرط کی حکمت پر روشنی ڈالی:

''قریش کی زبردست عصبیت کے ماتحت امام میں قریش النسب ہونے کی شرط لگی تاکہ پوری ملت اتفاق واتحاد کے رشتہ میں منسلک ہوجائے اور انتظام و انصرام بہ احسن وجوہ تکمیل پائے چنانچہ جب امارت و امامت قریش کے ہاتھ میں آئی تو قبائل وفد نے اس کا ساتھ دیا تو پھر سارا عرب قریش کے سامنے سرنگوں ہوا۔ پھر اسلامی فوجوں نے دور دراز ملکوں کو اپنے پاؤں سے روند ڈالا۔ عہدِ بنی اُمیہ اور بنی عباس میں امامت کی یہی بڑھتی ہوئی شان وشوکت باقی رہی یہاں تک کہ خلافت کمزور پڑگئی اور عرب عصبیت کا شیرازہ بکھرا۔'' (مقدمہ:ص ۲۰۰)

تیرہ صدی تک کسی محدث یا فقیہ نے جن احادیث کو بالجملہ موضوع نہیں کہا، چودھویں صدی میں مصری ڈاکٹر حسن ابراہیم نے جمہوریت کی نفی کرنے والی حدیث کو سر ٹامس آرنلڈ کا ریمارکس دے کر لکھ دیا کہ وہ ''حضور ﷺ سے غلط منسوب کردی گئی ہیں۔'' اسلامی تاریخ پر مغرب میں ریسرچ کرنے کا نتیجہ ہے کہ اُنہوں نے احادیث کی صحت کو پرکھنے کے لیے مغربی فکر وفلسفہ کو کسوٹی بنایا۔ جدیدیت کی یہی لہر مسلمانوں کے فکری زوال کا سبب ٹھہری۔

خلفاے راشدین کا تعین شورائیت سے ہوا

❶ واضح رہے کہ خلفاے راشدین مجلس شوریٰ کے مشورہ سے نامزد ہوئے، عوام کے ووٹوں سے منتخب نہیں ہوئے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں ہنگامی حالات کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ کی عزیمت اور تحمل مزاجی اور بشیر بن سعد انصاری کے خلوص نے خاطر خواہ اثر کیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: ''یہ ابوعبیدہؓ اور عمرؓ موجود ہیں، ان میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کرلو۔ اس پر حضرت عمرؓ اُٹھے اور حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا: ''آپ ہم سب میں سے بہتر اور رسول اللہ ﷺ کے سب سے قریب ہیں، اس لیے ہم سب سے پہلے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ یہ سنتے ہی سعد بن عبادہؓ کے سوا تمام حاضرین نے اس وقت حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ دوسرے دن مسجدِ نبوی میں اعلانیہ بیعت ہوئی۔

اکثریت کا دعویٰ کرنے والے انصار قبیلہ قریش کی عرب میں حیثیت اور ابوبکرؓ کی فضیلت سے متعلق دلائل سن کر حق خلافت سے دستبردار ہوگئے، اگر خلفاء راشدین کا دور جمہوری ہوتا تو

انصار یا قریش میں سے خلافت کے اعلانیہ اور خفیہ دعویدار رائے شماری کا مطالبہ ضرور کرتے۔

❷ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی مرض الموت میں اپنے بعد حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرنے کا ارادہ کیا تو شوریٰ سے مشورہ کیا تو حضرت عثمانؓ و دیگر ساتھیوں نے تائید کی کہ اُن کا باطن اُن کے ظاہر سے اچھا ہے۔'' جبکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت طلحہؓ نے مزاج میں سختی کا شکوہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا: ''وہ اس لیے تھی کہ میں نرم تھا، جب خلافت کا بوجھ سر پر پڑے گا تو سب سختیاں دور ہوجائیں گی۔'' لیکن تاریخ گواہ ہے کہ کسی صحابی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ ''آپ خلیفہ کو نامزد کیوں کررہے ہیں، خلیفہ نے تو تمام مرد و عورتوں پر حکومت کرنی ہے، اس لیے وہ ووٹنگ کے ذریعے خود ہی کسی کو خلیفہ خود منتخب کرلیں گے۔'' اگر کسی نے شکایت نہیں کی تو ثابت ہوا کہ نامزدگی جرم نہیں۔ مسجدِ نبوی میں بیعتِ عام کو ووٹنگ سے تشبیہ دینا نامناسب ہے۔ حضرت عمرؓ کے مخالف تو کوئی اُمیدوار تھا ہی نہیں جس کو ووٹ دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجدِ نبوی میں بیعتِ عام اطاعت کا اظہار تھی، رائے شماری ہرگز نہ تھی۔

❸ حضرت عمر فاروقؓ آخری وصیت فرما رہے تھے تو لوگوں نے کہا: اے امیر المؤمنین! کسی کو خلیفہ بنا جایئے۔ آپ نے کہا کہ خلافت کا حق دار ان چند لوگوں کے سوا کوئی نہیں جن سے حضرت محمد ﷺ راضی رہے۔ اُنہوں نے عشرہ مبشرہ میں سے چھ صحابیوں کا نام لیا۔ حضرت عمرؓ کے بعد زبیرؓ نے حضرت علیؓ، طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ کو اور سعدؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو اختیار دے دیا۔ پھر عبدالرحمٰنؓ نے دونوں سے کہا: ''کیا تم مجھے مختار بناتے ہو، خدا کی قسم میں اُسی کو خلیفہ بناؤں گا جو افضل ہوگا۔''

حضرت عمر فاروقؓ نے بدری و بیعت رضوان کے موقع پر مغفرت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے والے صحابہ کرامؓ کو حق خلافت سے محروم کرکے صرف چھ افراد کو نامزد کیا۔ جمہوری اُصول کے مطابق کیا یہ درست فیصلہ تھا؟ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں مردم شماری کا کام علیحدہ شعبہ کی حیثیت اختیار کرچکا تھا۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جمہوری انداز میں یہ کیوں نہیں کہا کہ میں اُس کو خلیفہ بناؤں گا جس کو مسلمان کثرتِ رائے سے منتخب کریں گے؟

حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں اسلامی سلطنت سوا لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی، لیکن

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ صرف اہل مدینہ کے چیدہ چیدہ احباب سے مسلسل تین دن رات مشورہ کرتے رہے، وہ احباب کی رائے کو حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کے حق میں گنتے نہیں رہے بلکہ علم وشعور کی کسوٹی پر پرکھتے رہے۔ آخر کار اُنہوں نے اس بنا پر حضرت عثمانؓ کو منتخب کیا تھا کہ وہ کتاب وسنت کے علاوہ پہلے دونوں خلفا کے نظائر کا بھی اتباع کریں گے، یہ بات حضرت علیؓ نے تسلیم نہیں کی تھی۔

ظاہر ہے کہ وسیع وعریض سلطنت میں لاکھوں نفوس پر مشتمل آبادی میں سے خلیفہ کے چناؤ کے لیے فردِ واحد کو ثواب دیدی اتھارٹی دینا جمہوری قواعد وضوابط کے عین منافی ہے۔

❷ شہادتِ عثمانؓ کے وقت بلوائی مدینہ پر چھائے ہوئے تھے اور پورے شہر کا نظم ونسق ان میں سے ہی ایک شخص غافقی بن حرب کے ہاتھ میں تھا۔ یہ لوگ حضرت عثمانؓ کی شہادت پر تو متفق تھے، لیکن آئندہ کس کو خلیفہ مقرر کریں؟ اس بارے اختلاف تھا۔ مصری حضرت علیؓ کے حق میں تھے، کوفی حضرت زبیرؓ کو چاہتے تھے اور بصری لوگ حضرت طلحہؓ کو امیر بنانا چاہتے تھے مگر تینوں صحابہ کرامؓ نے ان کے مطالبہ کو مسترد کردیا۔ پھر وہ یکے بعد دیگرے سعد بن ابی وقاصؓ اور عبداللہ بن عمرؓ کے پاس گئے۔ اُنہوں نے صاف انکار کردیا کہ ہمیں امارت کی کوئی ضرورت نہیں۔ پس ان لوگوں کو خطرہ لاحق ہوا کہ اگر ہم شہادتِ عثمانؓ کے بعد بغیر امیر کے تقرر کے اپنے شہروں کو چلے گئے تو ہماری خیر نہیں، چنانچہ ان لوگوں نے اہل مدینہ سے کہا کہ تمہیں دو دن کی مہلت ہے۔ اس دوران کوئی امیر مقرر کرلو، ورنہ اگلے دن ہم علیؓ، زبیرؓ اور طلحہؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں کو قتل کردیں گے۔ اس کے بعد وہ حضرت علیؓ کے پاس آئے، کہنے لگے، ہم آج امارت کے لیے آپ سے زیادہ مناسب کوئی آدمی نہیں سمجھتے۔ مسابقت فی الاسلام کی وجہ سے بھی اور حضور ﷺ کے ساتھ قرابت کی وجہ سے بھی۔ حضرت علیؓ نے کہا: ''ایسا نہ کرو، میں امیر بننے سے زیادہ وزیر بننا پسند کرتا ہوں۔'' لوگوں نے کہا خدا کی قسم! ہم تو آپ ہی کی بیعت کریں گے۔ حضرت علیؓ نے کہا تو پھر یہ مسجد میں ہوگی۔

وہ حضرت علیؓ کو ہمراہ لے کر مسجدِ نبوی آئے۔ حضرت علیؓ کی خواہش کے باوجود اہل شوریٰ اور اہل بدر کے جمع ہونے کا موقع میسر نہ آسکا۔ حافظ ابن کثیرؒ کے بقول:

''اُنہوں نے آپ سے اصرار کیا اور اشتر نخعی نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کی بیعت کرلی اور لوگوں نے بھی آپ کی بیعت کی۔'' (تاریخ ابن کثیر: جلد ہفتم رص ۴۴۶)

محاصرہ کے دوران مدینہ کے بہت سے افراد حالات کی سنگینی سے بچنے کے لیے دیگر علاقوں میں منتقل ہوگئے، تاہم جو کبار صحابہ کرامؓ موجود تھے، ان کا بلوائیوں سے اصرار تھا کہ مجلس شوریٰ خلیفہ کا تقرر کرے۔ تاہم حضرت علیؓ نے مدینہ منورہ کو مزید خون خرابہ سے بچانے کے لیے بیعت لینے کی حامی بھرلی۔ ماسوائے چند صحابہ کے مدینہ کے لوگوں کی اکثریت نے حضرت علیؓ کی بیعت کرلی۔اُن کا اجتہاد درست تھا۔ اس میں جمہوری اُصول کثرتِ رائے کی تو تائید ہوتی ہے، لیکن جمہوریت کے دوسرے پہلو آزادنہ اور خفیہ ماحول کی بہر حال نفی ہوتی ہے۔

❺ جب ابن ملجم نے حضرت علیؓ کو تلوار ماری تو لوگوں نے آپ سے کہا: امیر المومنین! خلیفہ مقرر کر دیجئے تو آپؓ نے فرمایا: ''میں خلیفہ مقرر نہیں کروں گا بلکہ تم کو اس طرح چھوڑوں گا جیسے رسول اللہ ﷺ نے تم کو چھوڑا تھا۔ یعنی خلیفہ مقرر کئے بغیر۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے تم سے بھلائی کرنی چاہی تو وہ تم کو اسی طرح تمہارے بہترین آدمی پر اکٹھا کردے گا جیسے اُس نے رسول اللہ ﷺ کے بعد تم کو تمہارے بہترین آدمی پر اکٹھا کر دیا تھا۔'' (تاریخ ابن کثیر: جلد ۸رص ۷۳۸)

جندب بن عبداللہ نے عرض کی: امیر المومنین! اگر آپ فوت ہوجائیں تو ہم حضرت حسنؓ کی بیعت کرلیں؟ تو آپ نے فرمایا: ''میں نہ تمہیں حکم دیتا ہوں اور نہ منع کرتا ہوں، تم بہتر سمجھتے ہو اور جب حضرت علیؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ بکثرت لا الہ الا اللہ کا ورد کرنے لگے اور اس کے سوا آپ کچھ نہ بولتے تھے۔'' (تاریخ ابن کثیر: جلد ہفتم رص ۶۴۱)

جب حضرت حسنؓ اپنے والدِ مکرم حضرت علیؓ کو دفن کرنے سے فارغ ہوئے تو سب سے پہلے قیس بن سعد بن عبادہ نے آگے بڑھ کر آپ سے کہا: اپنا ہاتھ پھیلائیے، میں کتاب اللہ اور اُس کے نبی ﷺ کی سنت پر آپ کی بیعت کروں۔ حضرت حسنؓ نے سکوت اختیار کرلیا تو اُس نے آپؓ کی بیعت کرلی۔ پھر اس کے بعد لوگوں نے آپ کی بیعت کی۔''

(تاریخ ابن کثیر: جلد ہشتم رص ۷۳۸)

تبصرہ وتجزیہ: پہلی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے نبی کریم ﷺ کی سنت پر

عمل کرتے ہوئے ولی عہد نامزد کرنے سے اجتناب کیا۔ جب دوسری دفعہ عقیدت مند نے حضرت حسنؓ کا نام لے کر دریافت کیا تو مذکورہ بالا جواب ارشاد فرمایا۔ چونکہ اس سے تاثر ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان مشورہ سے منتخب کریں، اس بنا پر عصر حاضر کے مؤرخین خلافتِ حسنؓ کے ضمن میں اسی کو ترجیح دیتے ہیں، تاہم اس سے دوسرا پہلو نکلتا ہے کہ اگر باپ کے بعد بیٹے کو خلیفہ یا ولی عہد نامزد کرنا شریعتِ محمدیؐ میں ناجائز عمل ہوتا تو سائل کو دوٹوک الفاظ میں منع کر دیتے اور وصیت نامہ میں جہاں دونوں بیٹوں کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے اور فواحش سے اجتناب کرنے کی وصیت کی وہاں اُن کو امورِ خلافت سے پرہیز کرنے کی وصیت کر دیتے۔

حضرت عمرؓ سے بعض لوگوں نے عبداللہ بن عمرؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کو کہا تو اس موقع پر حضرت عمرؓ اپنے بیٹے کی جذباتی طبیعت اور آخرت کی جواب دہی کا جواز پیش نہ کرتے بلکہ سختی سے منع کر دیتے کہ نسلاً خلافت منتقل کرنا شریعت میں ناجائز ہے۔

حضرت حسنؓ شوریٰ کے رکن قیس بن سعد کی تائید سے بیعت لینے پر رضا مند ہوئے، اس کے بعد تمام لوگوں نے آپؓ کی بیعت کر لی۔ یہ طرزِ عمل اُمتِ مسلمہ کے لیے مشعل راہ ہے۔ کیونکہ حضرت حسنؓ کا دور بھی خلفاے راشدین میں سے ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے غلام حضرت سفینہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''میرے بعد خلافت تیس سال ہوگی پھر بادشاہت ہوگی۔'' اور حضرت حسنؓ بن علیؓ کی خلافت سے تیس سال مکمل ہوگئے۔ آپ ربیع الاوّل ۴۱ ہجری میں حضرت معاویہؓ کی خاطر خلافت سے دستبردار ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات سے یہ پورے تیس سال بنتے ہیں کیونکہ آپؐ نے ربیع الاوّل ۱۱ ہجری میں وفات پائی۔'' (تاریخ ابن کثیر: جلد ۸/ص ۷۴۳)

خلفاے راشدین کا تیس سالہ دور 'خلافت علیٰ منہاجِ نبوت' پر تھا، اُن کا طریق کار صحیح و کامل معنوں میں طریق نبوت کے مطابق تھا۔ مخبر صادق ﷺ نے منہاجِ نبوت کی اہمیت سے آگاہ فرمادیا: «عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين» (سنن ابن ماجہ:۴۲)

حضرت علیؓ کے بعد اُن کے بیٹے حضرت حسنؓ کا انتخاب اور مدتِ خلافت بھی منہاج نبوت کا حصہ ہے اور کسی صحابی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ چنانچہ باپ کے بعد بیٹے میں امارت

کے شرعی اوصاف ہوں تو اُمت کے اتحاد و یکجہتی کی خاطر اُس کو خلیفہ منتخب کرنا شرعاً ناجائز نہیں لیکن جمہوریت کے دعویدار مسلم مفکرین کے نزدیک یہ ملوکیت ہے۔ یہ طرزِ عمل سیاسی و قانونی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ سے حضرت حسنؓ تک خلفائے راشدین کا انتخاب دارالخلافہ میں مقیم شوریٰ کے مشورہ اور مسلمانوں کی اطاعتی بیعت سے ہوا۔ انتخاب کے دوران دیگر محکوم علاقوں کے مسلم مدبرین کے مشورہ اور بالغ رائے دہی کا ذکر تاریخ میں نہیں ہے۔ مجلس شوریٰ کے ارکان بھی بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب نہیں ہوئے۔ بلکہ وہ اہلیت و قابلیت اور دعوت و عزیمت کی قربانیوں کی بدولت معروف ہوئے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کریں تاکہ پیش آمدہ مسئلہ کے تمام ممکنہ پہلوؤں پر غور وفکر کیا جائے کہ کون سا پہلو اقرب الی الحق ہے اور کتاب و سنت سے مطابقت رکھتا ہے۔ خلفائے راشدین کے دور میں شورائی انداز میں فیصلے ہوتے رہے جمہوری دور کی طرح سروں کو گننے کا رواج قطعاً نہ تھا۔

نظامِ خلافت تدریجی انداز میں زوال پذیر ہوا!

بنو اُمیہ (۶۶۱ء) سے لے کر عثمانیہ دور (۱۹۲۴ء) تک خلافتِ اسلامیہ قائم رہی، لیکن جدید مسلم مفکرین اس کو اسلامی حکومت تسلیم نہیں کرتے۔

'اسلامی حکومت' سے کیا مراد ہے؟

بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے حکومت کا قیام ضروری ہے، وہ حکومت عوام کی عزت، جان و مال کے تحفظ کے لیے قوانین وضع کرتی ہے۔ جب حکومت پر فائز اپنی مرضی سے قوانین بنائے تو شخصی حکومت ہوئی جب درباریوں کے مشورہ سے قانون سازی کرے تو اَشرافیہ کہلائی اور جب عوام کی منشا کے مطابق قانون تشکیل کرے تو اسے عوامی حکومت کہا جاتا ہے۔

مذکورہ فلاحی حکومتوں کو مملکتِ سیاسیہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن دینی نہیں، کیونکہ یہ انسانی عقل کے مطابق قانون وضع کرتی ہیں اور ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسان دنیا کے منافع حاصل کرسکے اور اس کی مضرتوں سے بچ سکے۔

① علامہ ابن خلدون 'دینی حکومت' کی تعریف کرتے ہیں:

''اگر یہ قوانین اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرتب و وضع ہو کر کسی رسول یا نبی کے ذریعے مخلوق تک پہنچیں تو اس کو ہم 'سیاست دینی' سے تعبیر کریں گے..... نظامِ خلافت اس سے عبارت ہے کہ سب کو شرعی نقطہ نظر کے مطابق زندگی گزارنے پر آمادہ کیا جائے جس سے آخرت کی سعادت بھی نصیب ہو اور دنیا کی وہ مصلحتیں بھی بہم پہنچیں جو سعادت اُخروی میں معاون و مددگار رہیں۔'' (مقدمہ ابن خلدون: ص۱۹۶)

عصر حاضر کی مسلم حکومتیں خواہ وہ آمرانہ ہوں یا عوامی طرز کی وہ انسان کی مادی فلاح کو مدنظر رکھ کر قانون سازی کرتی ہیں اور کہیں آخرت کی کامیابی کے لیے روحانی فلاح کا تصور تو ہرگز نہیں ہے۔

② مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ائمہ کے اقوال کی روشنی میں نظامِ خلافت کی تعریف کی ہے:

''مسلمانوں کی ایسی حکومت جو ارکانِ اسلام کو قائم رکھے، جہاد کا سلسلہ و نظام درست کرے، اسلامی ملکوں کو دشمنوں کے حملہ سے بچائے اور ان کاموں کے لیے فوجی قوت کی ترتیب اور لڑائی کا سامان وغیرہ جو کچھ مطلوب ہو، اُس کا انتظام کرے، مختصر یہ کہ اسلام کا خلیفہ وہ حکمران ہوسکتا ہے جو اسلام و ملت کے لیے دفاع و جہاد کی خدمت انجام دے سکے۔''

(مسئلہ خلافت: ص۱۲۶)

جہاں تک خلافت کی پیش نظر تعریف اور خلیفہ کے فرضِ منصبی کا تعلق ہے تو خلافتِ عثمانیہ تک مسلم حکومتیں اسلامی تھیں جنہوں نے اُمتِ مسلمہ کے دفاع اور اسلام کی سربلندی کے لیے جہاد کا فریضہ سرانجام دیا۔

خلافتِ اسلامیہ کے دور تک وسیع و عریض علاقے فتح ہوئے جہاں کی مقامی آبادی اسلام کے نظامِ عدل سے متاثر ہوکر مسلمان ہوئی، لیکن نئی نسل اس سے بے خبر ہے کیونکہ ثانوی درجہ تک علم تاریخ کا نصاب نوآبادیاتی دور کی تحریکِ آزادی تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ یونیورسٹی سطح پر بنواُمیہ اور بنوعباسیہ کی تاریخ شاملِ نصاب رہی ہے، لیکن عثمانیہ دور کی تاریخ سے نئی نسل کو محروم رکھا گیا۔ بنواُمیہ اور عباسیہ کے دور میں فتوحات کا دائرۂ کار ایشیا اور افریقہ تک رہا، لیکن عثمانی ترکوں نے یورپ کے مرکز میں جاکر 'اللہ اکبر' کی صدا بلند کی۔

ابوالکلام آزاد تحریر کرتے ہیں:

''عثمانی ترک نہ تو عرب پر قانع ہوئے نہ ایران وعراق پر، نہ شام وفلسطین کی حکومت اُن کو خوش کرسکی، نہ وسط ایشیا کی بلکہ تمام مشرق سے بے پروا ہوکر یورپ کی طرف بڑھے۔ اُس کے عین قلب (قسطنطنیہ) کو مسخر کرلیا اور اور اس کی اندورنی آبادیوں تک میں سمندر کی موجوں کی طرح در آئے حتیٰ کہ دارالحکومت آسٹریا کی دیوار اُن کے جولانِ قدم کی ترکتازیوں سے بارہا گرتے گرتے بچ گئی۔ ترکوں کا یہ وہ جرم ہے جو یورپ کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ مسلمانوں کا کوئی موجودہ حکمران خاندان اس جرم (فتح یورپ) میں اُن کا شریک نہیں ہے۔ اس لیے ہر حکمران مسلمان اچھا تھا جو یورپ کی طرف متوجہ نہ ہوسکا مگر یہ ترک وحشی وخونخوار ہے اس لیے کہ یورپ کا طلسم سطوت اُس کی شمشیر بے پناہ سے ٹوٹ گیا۔''

(مسئلہ خلافت، ص۱۱۶)

مسلمانوں کے جس دورِ خلافت کو جدید مفکر اسلامی حکومت تسلیم نہیں کرتے، اس دور میں امریکی جہاز مسلمانوں کی اجازت کے بغیر سمندر میں حرکت نہیں کرسکتے تھے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ

''محض تقریباً دو سو سال قبل عثمانی خلیفہ سلیم سوم کے دورِ حکومت میں خلافت کا الجزائر کا گورنر اس وقت کے امریکہ سے سالانہ چھ سو بیالیس ہزار ڈالر سونے کی صورت میں اور بارہ ہزار عثمانی سونے کے سکے بطورِ جزیہ وصول کرتا تھا۔ اس ٹیکس کے جواب میں الجزائر میں امریکی قیدیوں کی رہائی اور امریکی جہازوں کی بحر اکاہل اور بحر قلزم سے حفاظت کے ساتھ گزرنے کی گارنٹی دی جاتی تھی کہ عثمانی خلافت ان پر حملہ نہیں کرے گی۔'' (روزنامہ انصاف: ۲/ستمبر ۲۰۰۶ء)

اور آج افسوس کن صورتحال یہ ہے کہ امریکی بحری بیڑے مسلم بندرگاہوں پر لنگرانداز ہیں اور وہ افغانستان اور عراق پر میزائل داغ رہے ہیں۔

دورِ خلافت میں قائم وتابندہ رہنے والی حمیت ِ اسلامی وہ بنیادی جرم تھا جس کو مغرب نے معاف نہیں کیا۔ اُنہوں نے سازشی جال پھیلا کر خلافت ِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کردیا۔ اگر جمہوری نظام میں ملت ِ اسلامیہ کی یکجہتی وسلامتی اور اسلام کی عظمت وشرکت برقرار رہ سکتی تو ہمارے دشمن نظامِ خلافت ختم کرکے ترکی میں جمہوریت کو قطعاً رائج نہ کرتے۔

مخبر صادق ﷺ نے فرمایا:

''خلافت تیس سال رہے گی۔ خلفاے راشدین کی حکومت ۱۱ ہجری سے ۴۱ ہجری تک رہی۔ وہ دراصل خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی بشارت تھی جس کے بارے خود شارع علیہ السلام نے وضاحت فرمادی: «علیکم بسنتي وسنة خلفاء راشدین» (سنن ابوداؤد: ۴۶۰۷)

''تم پر میرا اور خلفاء راشدین کا طریقہ لازم ہے۔''

دورِ نبوی کے بعد خلفاے راشدین کا طرزِ عمل مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ جن کو بنیاد بنا کر قیامت تک رونما ہونے والے واقعات کا حل تلاش کرسکتے ہیں۔ لیکن اس سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ تیس سال کے بعد نظامِ خلافت یکسر ختم ہوگیا۔ نبی کریم ﷺ کی نبوت دائمی، ابدی اور عالمی حیثیت کی حامل ہو، پھر یہ کہنا کہ آپ کا رائج کردہ نظام ۳۰ سال تک رہا اس کے بعد یکسر ختم ہوگیا، یہ نظریہ عقیدہ ختم نبوت کے منافی ہے۔

صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ جن کے اَدوار کو نبی ﷺ نے بالترتیب بہترین زمانہ قرار دیا ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ اُن کے سامنے نظامِ خلافت کلی طور پر منہدم ہوگیا ہو اور وہ خاموش رہے ہوں؟ اگر باپ کے بعد بیٹے کی جانشینی شرعی جرم ہوتا تو قرونِ اولیٰ کے مسلمان ضرور مزاحمتی کارروائی کرتے۔

بنو اُمیہ سے عثمانیہ دور تک محدثین وفقہاے کرام نے اسلام کی سربلندی کے لیے عزیمت کی داستان رقم کی۔ یہ درست ہے کہ قبائلی عصبیت کی بنا پر بغاوتیں ہوئیں، کہیں لہو ولعب کو ہدف بنا کر مخالفت کی گئی، لیکن کسی تحریک نے موروثی خلافت کے خاتمہ کے ایشو نہیں بنایا۔ کیا وہ سب شریعت کے بنیادی فرض کی تکمیل سے غافل رہے۔ ملتِ اسلامیہ کے عظیم فاتح حکمرانوں کے تاریخی کردار کو داغ دار کرکے نئی نسل کو اسلاف سے متنفر کرنا اسلام کی خدمت نہیں بلکہ مغرب نوازی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اہل مغرب کے پرستار اعتراض کرتے ہیں کہ بعد کے دورِ حکومت میں جمہوری روح نہ تھی، وہ جمہوریت کی ماں برطانوی حکومت پر اُنگلی کیوں نہیں اٹھاتے کہ تمہارے ہاں آئینی طور پر بادشاہت کیوں قائم ہے؟

عام مشاہدہ کی بات ہے کہ کسی صوفی یا عالم نے دین کی خدمت کی یا مسجد و مدرسہ قائم کیا تو

عموماً اس کی مسند یا ادارہ کی ذمہ داری اس کے بیٹے کے سپرد ہوتی ہے۔ کیونکہ باپ کے بعد اہل بیٹے کو منتقل کرنے میں حکمتِ عملی یہ ہوتی ہے کہ جماعت رحلقہ میں یکجہتی وسلامتی کو خطرہ لاحق نہ ہو۔ باپ کے بعد بیٹے کی جانشینی نے خلافت کو ملوکیت میں منتقل نہیں کیا بلکہ یہ تدریجی عمل سے ہوا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں جو استحکام تھا، وہ عثمان غنیؓ کے آخری دور میں نہ رہا۔ بیرونی فتوحات کا سلسلہ حضرت عثمانؓ کے دور تک جاری رہا وہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے دور میں رک گیا۔ ابوالکلام آزاد اس تدریجی عمل کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''نبوت و رحمت کی برکات کی محرومی وفقدان کا ایک تدریجی تنزل تھا۔ اور بدعات وفتن کے ظہور و احاطہ کی ایک تدریجی ترقی تھی جو حضرت عثمانؓ کی شہادت سے شروع ہوئی اور جس قدر عہدِ نبوت سے دوری بڑھتی گئی، اتنی ہی عہدِ نبوت اور خلافت و رحمت کی سعادتوں سے اُمت محروم ہوتی گئی۔ یہ محرومی صرف امامت و خلافت کبریٰ کے معاملہ میں ہی نہیں ہوئی بلکہ قوام و نظام امت کے مبادیات واساسات سے لے کر حیاتِ شخصی وانفرادی اعتقادی وعملی جزئیات تک ساری باتوں کا یہی حال ہوا'' (مسئلہ خلافت: ص۱۰)

تابعین کا زمانہ خوب ہے، لیکن اس کا صحابہ کرامؓ کے دور سے موازنہ کرنا نامناسب ہے، اس طرح بنواُمیہ کے دور کا خلفاے راشدین سے تقابلی جائزہ کرنا غیر دانش مندانہ فعل ہے، کیونکہ خلفاے راشدین کا دور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا عکس ہے، البتہ ملوکیت کا موازنہ کرنا چاہیں تو آپ امن وانصاف، دعوتِ دین، اُمتِ مسلمہ کا دفاع اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کو بنیاد بنا کر اس جمہوری دور سے موازنہ کریں جو خلافت کے انہدام کے بعد مسلم ممالک میں رائج ہوا۔

مثلاً دورِ خلافت میں مساجد میں شرعی عدالتی فیصلے ہوتے تھے، آج عدالتوں میں۔ اُس دور میں اسلامی فقہ کو اتھارٹی حاصل تھی، آج عوامی تھانوں کو ہے۔ اس دور میں اسلامی قانون کے ماہر جج مقرر ہوتا تھا، آج مغربی قانون کا ماہر۔ یہ درست ہے کہ دورِ خلافت میں دین و دنیا میں تدریجی عمل سے خلیج حائل ہوئی، لیکن جمہوری دور نے ان کے مابین دیوارِ چین حائل کردی ہے۔

بنواُمیہ سے عثمانیہ دور تک نیک و بد حکمران آتے رہے تاہم کسی خلیفہ نے اسلام کے منافی قدم اُٹھایا یا قرآن وسنت کی من مانی تعبیر کی تو وہ راہِ حق میں عزیمت کا پہاڑ بن گئے۔ کوڑے کھا کر ادھ موئے ہوگئے۔ جیل کی کال کوٹھڑیوں سے جنازے نکلے لیکن خلافت کی ایک ہی

خاندان کی منتقلی پر کسی امام یا محدث نے مخالفت نہیں کی۔ اور وسیع وعریض سلطنت میں نہ سہی کم از کم دارالخلافہ میں بالغ رائے کی بنیاد پر انتخابات کرانے کا مطالبہ کبھی نہیں کیا گیا۔

یورپی اقوام نے مسلم ریاستوں پر تسلط جمایا تو اُنہوں نے مغربی فکر وفلسفہ کی بنیاد پر ایسا نصابِ تعلیم وضع کیا کہ ملتِ اسلامیہ کی نئی نسل کثرتِ رائے کے معیارِ حق ہونے کی ترجمان بن گئی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی، سلطان سلیم اور سلطان محمود غزنوی کی حمیتِ اسلامی اور تاریخی کارنامے ماند پڑ گئے اور مغربی جمہوریت کے فکر وفلسفہ کے داعی اُن کے ہیرو بن گئے۔

روس میں سوشلزم کی بیخ کنی کے بعد کرۂ ارض میں نظامِ خلافت اور نظامِ جمہوریت کے مابین جنگ جاری ہے۔ عالمی سطح پر جو لیڈر جمہوری نظام پر یقین رکھتے ہیں اور حکومت کی تبدیلی کے لیے آئینی جدوجہد کرتے ہیں، اہل مغرب اُن کو گڈ بک میں جگہ دیتے ہیں۔ وہ لیڈر یا تنظیمیں جو اس کے علاوہ کسی اور نظام پر اعتماد رکھتی ہیں اہل مغرب کے نزدیک انتہا پسند، ظالم اور دہشت گرد ہیں۔ امریکی صدر بش نے اس بات کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے، ذیل میں دی گئی رپورٹ سے ملاحظہ فرمائیے:

> ''جارج ڈبلیو بش نے کیلیفورنیا میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں عوام کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ ہم اکیسویں صدی کی نظریاتی جدوجہد میں ہیں۔ یہ جدوجہد اچھائی اور بُرائی کے درمیان ہے۔ یہ جدوجہد جمہوریت پر یقین رکھنے والوں اور ظلم وتشدد کی مدد کرنے والوں کے مابین ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ دشمن ہمیں نقصان پہنچانے کے لیے مستقل منصوبہ بندی اور سازشوں میں مصروف ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد ہم نے یہ عزم کر رکھا ہے کہ جب تک ان انتہا پسندوں کو شکست نہیں دے لیتے اور ان کا خاتمہ نہیں کر لیتے ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔'' (نوائے وقت، لاہور: ۶ راکتوبر ۲۰۰۶ء)

صہیونیت نے سوشلزم کی حوصلہ شکنی کرنے کے بعد اسلام کو اپنا ہدف بنالیا۔ نائن الیون کا حادثہ اس سازش کی کڑی تھی۔ پینٹا گون کی فرضی تحقیق میں جو مسلمان ملوث کیے گئے، اُن میں ایک بھی طالبان نہ تھا، لیکن طالبان کا قصور یہ تھا کہ اُنہوں نے اپنی قیادت کو بالغ رائے دہی سے منتخب نہیں کیا تھا۔ عوام سے قانون سازی کے اختیار سلب کر لیے اور فقہ اسلامی کو قانونی اتھارٹی دی۔ یہی جرم انتہا پسندی ہے جس کے وہ مرتکب ہوئے۔ یہ درست ہے کہ اہل مغرب

وسط ایشیا کے معدنی وسائل پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، لیکن یہ ثانوی مقصد تھا۔ دراصل ان انتہا پسندوں کے نظام کو درہم برہم کرنا اُن کا بنیادی مقصد تھا، یہ نظریات کی جنگ ہے جس میں مالی مفادات بھی پیش نظر ہیں۔

مجاہدین نے عراق پر امریکی قبضہ کے فوراً بعد مزاحمت شروع کردی۔ آئے روز گوریلا کارروائیوں میں نیٹو فوجی ہلاک ہورہے ہیں۔ مغربی تھنک ٹینک نے اتحادی فوج کی مایوسی اور مجاہدین کے تازہ دم ولولہ کو مدنظر رکھ کر تجزیہ کیا کہ عراق امریکہ کے لیے ویت نام بن چکا ہے۔ تب امریکہ میں بش کی عراق پالیسی کے خلاف مظاہرے ہوئے تو بش نے عوام کو اعتماد میں لینے کے لیے ہر جگہ کہہ رہا ہے کہ دہشت گرداز سرنو خلافت آئیڈیالوجی کو پھیلانا چاہتے ہیں:

''امریکی صدر بش نے ۱۱/اکتوبر ۲۰۰۶ء کو وائٹ ہاؤس میں تقریر کرتے ہوئے ایک ہی جملہ تین مرتبہ دہرایا کہ ''عراق میں امریکی فوجوں کی موجودگی صرف اس لیے ہے کہ دہشت گردوں کو خلافت ِاسلامیہ جیسی مملکت قائم کرنے سے روکا جاسکے۔'' بش نے اپنے خطاب میں مزید کہا کہ دہشت گرد خلافت آئیڈیالوجی کو پھیلانا چاہتے ہیں اور ایک ایسی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں آزادی اور لبرل ازم کی کسی چیز کا کوئی تصور نہ ہو۔ امریکی صدر بش نے کہا کہ خلافت اسلامیہ کی طرز پر انتہا پسندوں کی مملکت قائم ہونے سے امریکی و یورپی ممالک کے مفادات اور سلامتی کو شدید خطرہ لاحق ہوجائے گا۔'' (ہفت روزہ ندائے ملت: ۲۶/اکتوبر ۲۰۰۶ء)

تاریخ اسلام کا دورِ خلافت جس میں مسلم حکمران یورپ میں داخل ہوکر دعوت و جہاد کا پرچم بلند کرتے رہے، حیرت ہے کہ مغربی فکر وفلسفہ سے متاثر جدید مسلم سکالر بنواُمیہ سے بنی عثمانیہ کے دور کو اسلامی حکومت میں شمار نہیں کرتے، لیکن اہل مغرب آج بھی نظامِ خلافت سے لرزہ براندام ہیں۔

عراق کی آٹھ مزاحمتی تنظیموں نے 'دولت العراق الاسلامیہ' کے نام سے اپنی حکومت کا اعلان کردیا ہے۔ یہ درست ہے کہ عرب حکمران محوِ استراحت ہیں، لیکن عرب عوام میں جہادی جذبہ اُمڈ آیا ہے۔ وہ اہل مغرب کے خدشہ کو حقیقت کا رُوپ دینے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ وہ خلافت آئیڈیالوجی کو مشرق ومغرب میں پھیلا کر رہیں گے۔ ان شاء اللہ!